R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۱-۲-۶۶

فی پرچہ ...
قیمت سالانہ ...
[illegible]

جلد ۲۵ - شمارہ ۵ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم فروری ۱۹۶۶ء

اداریہ

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا

نئی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ۲۶ جنوری کو قوم کے نام ایک ولولہ انگیز پیغام کے آخر میں کہا:۔

"آج میں پھر قوم کے معماروں کے آدرشوں سے وفاداری کا عہد کرتی ہوں، جمہوریت سے، سیکولرزم سے، منصوبہ بندی کے ذریعہ اقتصادی اور سماجی ترقی سے، امن سے اور قوموں کے درمیان دوستی کے آدرش سے وفاداری کا عہد۔

ہندوستان کے شہریو! آؤ مستقبل میں اپنا عقیدہ تازہ کریں، آؤ اس بات کا اعلان کریں کہ ہم اپنی تقدیر کی خود تشکیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہم ایک عظیم تجربے میں شریک ہیں، ہمیں اس کے شایانِ شان اور اپنے عظیم ملک کے شایان بننا ہے"۔

نہرو کی بیٹی اور معمارِ ہند کی نورِ نظر سے ہمیں ایسے ہی خیالات کی توقع تھی۔ جمہوریت اور سیکولرزم کے فروغ ہی میں ملک کی زندگی اور طاقت ہے۔ منصوبہ بندی کے طریقۂ کار پر چل کر ہی ہم اقتصادی طور پر ملک کو اونچا اٹھا سکتے ہیں۔ ہمیں امن سے محبت ہے اور ہم قوموں کے درمیان دوستی کی فضا بڑھانے کے لیے ہر ممکن کوشش ضروری سمجھتے ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے پر اور اپنے ملک پر اور اس کے مستقبل پر بھروسہ ہونا چاہیے اور اپنی تقدیر خود بنانے، اپنے پیروں پر کھڑے ہونے، اپنی ضروریات کے لیے بڑی حد تک خود کفیل ہونے، اپنے راستے سے دنیا کی بزم میں شریک ہونے کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیے۔ پچھلے ڈیڑھ سال میں دو دفعہ ہندوستان کو اپنے وزیر اعظم کا انتخاب کرنا پڑا۔ اخباری دنیا میں کیسی کیسی کھچڑی پک رہی تھی کہ دیکھیے نہرو کے بعد ہندوستان کا کیا حشر ہوگا۔ مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ شاستری نے نہرو کے نقشِ قدم پر چل کر رزم اور بزم دونوں میں ہندوستان کا نام روشن کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ اندرا گاندھی بھی نہرو اور شاستری کے نقشِ قدم پر چلیں گی اور ان کی قیادت میں جمہوریت اور سیکولرزم کو اور طاقت اور مضبوطی ملے گی، قومی یکجہتی بڑھے گی اور تمام زبانوں اور تمام فرقوں کو ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔ اس نازک لمحے میں جبکہ ہمارا ملک کئی مشکلات میں گھرا ہوا ہے اور خصوصاً غذا کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے، ہم سب کا فرض ہے کہ نئی وزیر اعظم کے ہاتھ مضبوط کریں اور خاموشی اور استقلال سے ہر دشواری پر قابو پائیں۔ ہم نئی وزیر اعظم کا سچے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ پورا ملک ان کی آواز پر لبیک کہنے کو تیار ہے۔ پینتالیس کروڑ انسانوں کی نگاہیں ان کی طرف لگی ہوئی ہیں اور پینتالیس کروڑ دل ان کی مٹھی میں ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں:۔

ساتھ تو ہے تو یہ اغیار کی چشمک کیا ہے
بدلیوں سے کہیں کرنوں کا سفر ٹھیرا ہے
کہیں روکے سے نسیمِ سحری رکتی ہے
کیا کہیں قافلۂ فکر و نظر ٹھیرا ہے

اس شمارے میں

ایک قومی سانحہ

ایرانڈیا کے اس حادثے میں جو حال میں سوئیزرلینڈ میں ہوا ایک سو ترہ آدمیوں کی جانیں گئیں جن میں ہمارے عظیم سائنس داں ڈاکٹر بھابھا بھی تھے۔ اتنے آدمیوں کا اس طرح چند لمحوں میں موت سے دوچار ہو جانا، ایسا بڑا قومی سانحہ ہے کہ اسے بھلایا نہ جاسکے گا اور اس کے ساتھ یہ صدمہ بھی رہے گا کہ مرنے والوں میں ہمارا وہ ایسا نامور سائنس داں تھا جس کا بدل بڑی مشکل سے پیدا ہو گا۔ بھابھا نے جوہری توانائی کے کاموں کو جو ترقی دی اس توانائی کے امن کے کاموں کے لیے استعمال کی جو کوششیں کیں ہندوستان کو سائنس کی دنیا میں جس طرح درجہ بلند کیا اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ احسان مندی اور ممنونیت کے جذبات کے ساتھ یاد کیے جائیں گے۔ یوں تو موت ایک دن سب کو آتی ہے مگر جب ڈاکٹر بھابھا جیسے دانش ور اور اہل نظر یوں اچانک ہم سے رخصت ہو جائیں تو آنکھ پرنم ہو ہی جاتی ہے اور دل کی بستی ویران سی لگتی ہے۔ امید ہے کہ بھابھا کے ساتھی اور شاگرد ان کے کام کو جاری رکھیں گے اور اس حادثے کے بعد اور محنت اور جانفشانی سے سائنسی تحقیق کے کام کو آگے بڑھائیں گے۔

حضرت سہروردی کو سونے کا تمغہ

ممتاز شاعر و ادیب حضرت سہروردی (صدر شعبۂ عربی جمال محمد کالج کے ۱۹۶۰ء) میں تامل رائٹرس اکیڈمی (رجسٹرڈ) کی جانب سے ۱۹ر دسمبر کو زیر صدارت جناب سی۔ پی۔ راماسوامی آیر وائس چانسلر اناملے یونیورسٹی مدراس میں ایک جلسہ ہوا جس میں موصوف کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں سونے کا تمغہ پیش کیا گیا۔ جلسے میں عمائدین شہر شعرا و ادیب کثیر تعداد میں شریک تھے۔ مدراس اسمبلی کے سپیکر جناب چلا پانڈین نے بھی شرکت فرمائی۔ صدر جلسہ جناب راماسوامی آیر نے تامل زبان کی شہرۂ آفاق تصنیف "ترو کورل" کے اردو ترجمہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت سہروردی نے اس کام کو سرانجام دے کر بیک وقت اردو اور تامل زبان کے لوگوں کو ممنون کیا ہے۔ حضرت سہروردی نے تامل رائٹرس اکیڈمی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے مناسب الفاظ میں ہدیہ تشکر پیش کیا۔

تاشقند کے اسکولوں میں اردو ہندی تعلیم

نئی دہلی ۱۷ر جنوری۔ ازبکستان کی راجدھانی تاشقند کے ایک پرائمری اسکول میں ہندی کی تعلیم لازمی مضمون قرار دی گئی ہے اور نو کنڈر گارٹن کے کلاسوں سے لے کر گیارہویں کلاس تک ہندی کی تعلیم لازمی ہوگی۔

اسکول کے منتظم نے کہا "ہم چاہتے ہیں کہ جونہی لڑکے اور لڑکیاں ہندی کی کافی واقفیت حاصل کرلیں اس اسکول میں ہندی کو ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے۔ اس اسکول میں لگ بھگ ۱۱۰ لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتے ہیں۔

اس کے علاوہ تاشقند کے غیر ملکی زبانوں کے انسٹی ٹیوٹ میں تقریباً ۳۰۰ لڑکے لڑکیاں ہندی اور اردو کے پانچ سالہ ڈگری کورس کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی ایک ۲۰ سالہ طالبہ اینشا نے کہا: ہمیں امید ہے ہم ہندی کے ٹیچر اور ترجمان بنیں گے۔ حکومت ازبکستان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے مزید ہندی طالب علم ہندستان بھیجنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

غالب کا شعر

جسے شاستری جی پڑھا کرتے تھے

نئی دہلی ۱۰ر جنوری۔ اپنے اسکول کے دنوں میں لال بہادر شاستری اکثر مرزا غالب کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مرکزی وزیر صنعت و رسد سنجیوی ایں سنگھ نے جو شاستری جی کے ہم مکتب تھے آج یہاں ایک عام جلسہ میں یہ انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ بدقسمتی سے غالب کا شعر شاستری جی کے معاملہ میں صادق آیا کیونکہ دیار غیر میں ان کی موت ہوئی جہاں کوئی رشتہ دار تیمارداری یا نوحہ خوانی کے لیے موجود نہ تھا۔

ہندوستان میں فلسفیانہ تصورات کا ارتقاء

تاشقند میں تحقیقی کام کا آغاز

تاشقند۔ مشرقی علوم کے تحقیقاتی مرکز نے ہندوستان میں عہد آزادی کے دوران فلسفہ کی ترقی کی تاریخ کے بارے میں تحقیقاتی کام وسیع پیمانے پر شروع کیا ہے۔

اس مرکز میں جس عہد پر تحقیق کی جائے گی وہ انیسویں صدی کے اواخر سے موجودہ صدی کی پانچویں دہائی کے ختم تک کا دور ہے۔ چار جلدوں میں گاندھی جی، رام موہن رائے، راما کرشنا، اربندو گھوش، رابندر ناتھ ٹیگور اور دیگر ممتاز مفکرین کے فلسفوں کا تجزیہ کیا جائے گا۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ازبکستان میں

تاشقند (نووستی) اردو کے ممتاز افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کے ایک مجموعہ کا ازبک زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کا نام لاجونتی ہے۔ اس مجموعہ میں پانچ مختصر کہانیاں اور ایک طویل افسانہ "ایک چادر میلی سی" شامل ہے۔ یہ ترجمہ ازبک ماہر لسانیات زینت اللہ آشر بائیف نے کیا ہے۔

کوکب قدر سجاد علی مرزا

عشق نامہ

مثنوی عشق نامہ سے متعلق مزاح المومنین کا سلسلہ[1] پچھلی گرمیوں سے شروع ہوا تھا جس نے گزشتہ ہفتہ کے ہماری زبان میں ایک دلچسپ کروٹ لی ہے اور اب صرف وہی لوگ اس میں شریک نہیں ہیں جو بالعموم موضوع سے کافی واقفیت نہ رکھتے تھے[2] بلکہ وہ صاحبانِ بصیرت بھی اس میں شریک ہیں جو اس موضوع پر منتہی کہے جانے کے مستحق ہیں۔ مولوی نجم الغنی نے تاریخ اودھ میں جس مثنوی کے اشعار نقل کیے ہیں اس کا نام کیا ہے اور اس کا مکمل نسخہ کہاں ہے؟ سے اس بحث کا آغاز[3] ہوا تھا اور رفتہ رفتہ نہ صرف مثنوی کا نام اور سنہ تصنیف معرض بحث میں آ گیا بلکہ خود اس مثنوی کی تصنیف کے بارے میں شبہ ظاہر کیا جانے لگا کہ آیا یہ واجد علی شاہ کی تصنیف ہے یا مظفر علی خاں اسیر کی۔ ان سوالات کا مکمل اور تشفی بخش جواب مجھ جیسے نا اہل کے امکان سے باہر ہے اور جواب دینے کی خواہش بھی نہیں کیونکہ عشق نامہ کے بارے میں یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ یہ واجد علی شاہ کی سکینڈلز کا اعمال نامہ ہے، ہندوستانی اور پاکستانی پبلشروں کو وہی شخص مکمل نسخہ کا پتہ بتائے گا جو اس اعمال نامہ کو روپے بارہ آنے میں فروخت کروانا چاہتا ہو۔ محترمی پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کی واجد علی شاہ سے ہمدردی اور دور اندیشی سے ہمیں یہی امید تھی کہ وہ تیغ باد اور بدست راہزن کی غلطی نہیں کریں گے لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھی امید تھی کہ پروفیسر صاحب یا اس بحث میں دخل انداز نہ ہوں گے یا ہوں گے تو اپنے جامع مضمون میں کم از کم اس روایت کی تردید یا تائید ضرور کر دیں گے جو ان سے منسوب ہے اور جس کا جواب بھی صرف وہی دے سکتے ہیں۔

ہماری زبان کے مراسلہ نگار سید سلیمان حسین صاحب نے پروفیسر صاحب ہی کے حوالے سے لکھا تھا کہ:

"عشق نامہ منظوم کے بعض حصے اتنے شاعرانہ ہیں کہ شک ہوتا ہے کہ یہ واجد علی شاہ کی تخلیق نہیں ہیں۔"

پروفیسر صاحب نے واضح الفاظ میں نہ اس بیان کی تائید کی ہے نہ تردید بلکہ مبہم الفاظ سے اگر کوئی معنی اخذ کیے جا سکتے ہیں تو اس بیان کے بعد:

"ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر نے واجد علی شاہ کے حکم سے کسی کتاب کو نظم کیا۔ ممکن ہے کہ وہ کتاب یہی عشق نامہ ہو۔"[1]

ہم اس نتیجہ پر پہنچنے میں غلطی نہیں کریں گے کہ پروفیسر صاحب عشق نامہ منظوم کو واقعی واجد علی شاہ کی تصنیف نہیں سمجھتے لیکن چونکہ سالہا سال سے عشق نامہ منظوم انھیں کی تصنیف کہلاتا رہا ہے اور اصل مسودہ (فارسی نثر) واجد علی شاہ ہی کا ہے اس لیے عشق نامہ کو واجد علی شاہ ہی کی تصنیف سمجھنا چاہیے۔ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔ ہمیں اب تک اسی کا یقین نہیں کہ پروفیسر صاحب واقعی ایسا سمجھتے ہیں یا محض گفتگو کو مختصر کرنے کے لیے ایسا لکھا ہے۔ بالفرض اگر ان کا یہی خیال ہو تو میں بصد ادب گزارش کروں گا کہ میں اس خیال سے متفق نہیں اور چونکہ محقق نہیں مبتدی ہوں اس لیے بغرض اصلاح اپنے خیالات اور دلائل کو پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ہمیں امید ہے کہ پروفیسر صاحب اس جسارت کو معاف فرمائیں گے۔ جس موضوع پر دلی عقیدت کے سبب پروفیسر صاحب نے برسوں ریاض کیا ہے خوبیٔ قسمت سے مجھے بھی اسی موضوع کے تحفظ کی خدمت سونپی گئی ہے اور اس خدمت کی ادائگی میں اگر کوئی قصور واقع ہو تو محافظ کی نیت پر شبہ کرنا یا اس کی خدمت سے کسی کی دل آزاری مراد لینا انصاف سے بعید ہوگا۔ واجد علی شاہ پر عائد کردہ الزامات کی فہرست میں جہاں ان کو ہیرے جواہرات کا چور بتایا گیا حالانکہ اس شخص نے زندگی کے کسی دور میں بھی گرانبہا لعل و جواہر کو ٹھیکریوں سے زیادہ وقعت نہیں دی۔ وہاں اس کو کبھی ناداستگی اور کبھی دیدہ دلیری سے ایک ایسی مثنوی کا نامزد مصنف بتانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے جس کا مثل، کیا بلحاظ خوبیٔ کلام اور کیا بلحاظ تعداد اشعار، اس کی دوسری مثنویوں میں بھی موجود ہے اور جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے کم نہیں اور جن کا وہ بلاشبہ اور بلا شرکت غیرے مالک ہے۔

خود اپنے زمانے میں شعر و ادب کی تنزلی کا احساس رکھتے ہوئے اور آنے والی نسلوں کی خوش بختی اور سخن فہمی پر اعتماد کرتے ہوئے واجد علی شاہ نے بڑی امیدوں کے ساتھ آرزو ظاہر کی تھی:[2]

اشارے گئے علم کے اس لیے — کہ راقم کو اس کی کوئی داد دے
وگرنہ زمانہ کہاں ہم کہاں — ہوا دین عشقی وہ عالم کہاں
زمانے میں پوچھے گا کون اب ہنر — نہ عربی نہ اردو کی لے گا خبر

---

[1] ہماری زبان ۲۲ر جون ۱۹۶۵ء میں اکبر علی خاں کا استفسار
[2] ہماری زبان یکم ر نومبر ۱۹۶۵ء میں اکبر علی خاں کا مراسلہ
[3] ہماری زبان ۲۲ر ستمبر ۶۵ء

[1] ہماری زبان ۱۵ر جنوری ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۲
[2] قیصر مضمون مطبوعہ مطبع سلطانی کلکتہ صفحہ ۵۰۔۵۱

وہ ہم تک یہ سامان سار آگیا — کہ اب کسب تک بھی ہمار آگیا
گر ہاں جو ہوویں گے پیدا نئے — جہاں میں جو ہونگے ہویدا نئے
وہ البتہ جانیں گے اس دور کو — وہ سمجھیں گے حق حق اسی طور کو

عشق نامے کے سلسلے میں اعتراضات کی بوچھار مجبور کرتی ہے یہ کہنے پر کہ انصاف پسندی اور حق شناسی کا وہ دور آج بھی اتنا ہی دور ہے جتنا کہ سو سال پہلے تھا۔ بلکہ اس لحاظ سے واجد علی شاہ خوش نصیب تھے کہ ان کے اپنے زمانے میں اگر کوئی قرار واقعی داد نہ دیتا تھا تو کم از کم ان پر سرقہ کا الزام بھی عائد نہ کیا جاتا تھا اور آج نہ وہ صرف داد سے محروم ہیں بلکہ فریاد کی بھی قدرت نہیں رکھتے۔ خود لکھنا اور دوسروں سے لکھوانا۔ خود ترجمہ کرنا اور دوسروں سے ترجمہ کروانا۔ خود چھاپنا اور دوسروں کو آمادہ کرنا کہ اپنا کلام چھپوائیں وہ طریقے تھے جن کے ذریعہ علم و ادب کی حتی المقدور اشاعت اور تحفظ کو وہ ایک مقدس فریضے کے طور پر تاعمر انجام دیتے رہے۔ اس لیے کہ اس خدمت کے ساتھ ان کی یادگار باقی رہے۔ ہماری نظروں کے سامنے اس کے آثار تو باقی ہیں لیکن مسخ ہو رہے ہیں اور مسخ کیے جا رہے ہیں۔

قطع نظر اس قلمی نسخے کے کہ جو خود مصنف کے قلم سے اس کا اعلان کر رہا ہے کہ عشق نامہ منظوم کا مصنف کون ہے اور قطع نظر ان داخلی شہادتوں کے جو اس مثنوی میں موجود ہیں اور بزبانِ بے زبانی گواہی دے رہی ہیں کہ ہم کس کے مرہونِ منت ہیں اور جن کی مفصل کیفیت اخباری بیان سے بہتر صورت کی متقاضی ہے ہمیں سب سے پہلے ان گواہوں کا جائزہ لینا چاہیے جو مدعی ہیں اس امر کے کہ عشق نامہ منظوم مظفر علی خاں اسیر کی تصنیف ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ کوا کان لے گیا اور ہم کوے کے پیچھے دوڑنے لگیں تو لوگ ہنسیں گے کہ یہ نہ اپنے کان کو دیکھتا ہے اور نہ آواز کسنے والے کو خواہ مخواہ کوے کے پیچھے پریشان ہے عشق نامے کے معاملے میں بھی تقریباً یہی صورت درپیش ہے۔ واجد علی شاہ، اسیر، تعلق، اور ان کی صلاحیتوں اور تعلقات کے چشم دید گواہ سب اپنی اپنی قبروں میں جا سوئے وہ کیا کرتے تھے اور کیا کہہ گئے اس کا ثبوت اور تشریح کی ذمہ داری اس شخص پر ہے جو موجودہ نسل میں پچھلی نسل کی باتوں کو یاد دلائے اور ان سے کوئی قابلِ ذکر نتیجہ اخذ کرنے کا مدعی ہو۔ عدالت میں ایسی باتوں کی کوئی شنوائی نہیں جو محض شنیدہ ہوں، لیکن ادب میں جہاں اور ہر طرح کی بے ادبی کی اجازت ہے وہاں اس پر بھی کوئی پابندی نہیں کہ کہنے والے سے کوئی اتنا ہی پوچھ لے کہ بندۂ خدا تیرے پاس اپنے بیان کا کوئی معقول یا نامعقول عذر بھی ہے یا نہیں۔ چنانچہ اسی رعایت اور مروت کا نتیجہ ہے کہ کبھی کلامِ بشر کو کلامِ خدا بتایا جاتا ہے اور کبھی کلامِ خدا کو کلامِ بشر۔ کبھی غالب کا دیوان مالِ مسروقہ بن جاتا ہے اور کبھی شیکسپیئر مع اپنے تمام ڈراموں کے ایک خیالی پیکر۔ اس طرح کی بے عنوانیاں اگر عام اہلِ قلم کریں جب بھی مضائقہ نہیں۔ لطف یہ کہ قانونِ شہادت سے واقف انسان بھی جو کمرۂ عدالت میں بےجوڑ سی باتیں کہنے کی جرأت نہ کریں، صحافت کی دنیا میں چل چل میرے خامے بسم اللہ کہہ کر بلا تکلف اشہبِ قلم کی جولانیاں دکھاتے ہیں اور دادِ طلب نظر آتے ہیں۔ شیخ تصدق حسین بحیثیت ایڈوکیٹ اور مضمون نگار گمنام بھی نہیں۔ اسیر کے خود نوشت حالات کا حوالہ دیتے ہوئے:۔

"...... دنیا سے دل بہت برخاستہ تھا۔ کسی بزم آراستہ سے کام نہ تھا۔ ناگاہ ایک شاہی خواص آیا۔ اور مجھے دیوان خاص میں لے گیا۔ وہاں حضرت سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر سریر آرا فروز تھے...... مجھ جیسے ناچیز سے خلق کیا۔ امتیازی درجے سے پاس بٹھایا۔ ایک ایسی کتاب عنایت فرمائی جو درحقیقت گل انتخاب تھی۔ میں نے حسب الحکم اسے نظم کیا اس سے بہت خوش ہوئے مجھے بھی ان کی خوشی سے مطلب تھا۔"[۱]

شیخ صاحب حاشیہ چڑھاتے ہیں:۔

"اسیر نے گو کتاب کا نام نہیں ظاہر کیا ہے مگر گمان غالب یہ ہے کہ یہ تاریخ پری خانہ تھی...... آن کی فرمائش سے اسے اردو میں نظم کیا گیا۔ اور اس کا نام پری خانہ منظوم رکھا گیا۔ یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اسیر نے نظم کیا مگر اس میں رنگ اسیر کا جھلکتا ہے۔ واجد علی شاہ کی طرزِ سخنوری سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔"[۲]

اسیر کا مندرجہ بالا بیان "تذکرہ آب بقا صفحہ ۹۶" سے ماخوذ ہے۔ شیخ صاحب نے حوالے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ حوالہ اس لیے ضروری ہے کہ جب عبارت تعبیر کی جاتی ہے تو اس کی بنیاد بھی ہوتی ہے یہاں پورا قلعہ تعمیر ہے لیکن ہوا میں۔ حوالہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے بیان کے زمانے کا تعین ہو سکے یہ مسئلہ تذکرہ آب بقا کے حوالے سے حل ہوتا ہے۔ اور مثنوی معارج الفضائل کے حوالے سے[۳] کیونکہ ان دونوں کی طباعت زمانۂ شاہی کے بعد کی ہے۔ مثنوی درۃ التاج جو مطبع سلطانی سے شائع ہوئی اس میں بھی اسیر نے کتاب کا نام نہیں بتایا ہے لیکن ایک اسی طرح

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

۱؎ مشمولہ نسخۂ قلمی، ۱۲۶۶ھ ص[illegible] مخزونہ [illegible] انجمن [illegible] زیرِ نگرانی

۱؎ نیا دور (لکھنؤ) اگست ۱۹۵۹ء ص۔
۲؎ مسعود صاحب عبارت نقل کر چکے ہیں، تکرار بے سود ہے۔
۳؎ ہماری زبان ۱۵ جنوری ۱۹۹۶ء ص۴

اعجاز صدیقی

مژدۂ غم رُبا

(تاشقند کانفرنس کا طربیہ اور المیہ)

مژدہ باد اہلِ چمن! رک گئی وہ بادِ سموم
جس نے سوچا تھا کہ شعلوں کی قبا جل جائے
جس نے چاہا تھا کہ شاخوں کو جھلس کر رکھ دے
ذرّۂ گل آتشِ سیّال بنے، گل حباب بنے
دل میں پیوست جو خنجر تھے، وہ باہر نکلے
چھوڑ دی سینہ فگاری کی ادا تیروں نے
کم ہوئی روح میں چبھتے ہوئے کانٹوں کی خلش
پاؤں نے غم چھوڑ دیا کانپتی زنجیروں نے
رک گئیں خون کی بہتی ہوئی پاگل ندیاں
خندقیں اب نہ بھری جائیں گی پھر لاشوں سے
داغ اب کھا نہ سکے گا کوئی مظلومی کے
زخم اب رنجیدہ نہ رکھیں گے نمک پاشوں سے
بادہ چھلکا کہ دوا ہو گیا میخانے کا درد
جام ٹکرائے، کہ رو دیتے ہوئے میخوار تھے
تھوڑی بیٹھے تھے جو آئینِ وفا، رسمِ خلوص
لے کے نذرانۂ دل، پھر وہی دلدار ملے
شبِ دیجور کے ماتھے کی شکنیں ہٹ کے رہیں
اتصالِ مہ و خورشید ہوا، رقص کرو
جو بڑھا راہِ تدبر میں — وہ پہلا ہی قدم
امن اور صلح کی تمہید ہوا، رقص کرو

کسے معلوم تھا، اس رقص کی جھنکاروں کو
ڈوبنا ہوگا غم و رنج کی آوازوں میں!
جن کو ہاتھوں نے اٹھایا تھا ابد جینا تھی
درد کی چیخ ابھر آئے گی ان سازوں میں!
کسے معلوم تھا، پردیس میں دینے کے لیے
قیمتِ صلح و صفا، قیمتِ جاں ٹھہرے گی
کسے معلوم تھا اپنے ساتھ رک کر اک سانس
ساری دنیا کے لیے ایک مثال ٹھہرے گی
منزلِ شوق جب آئی تو ہوا راہبر گم
دے کے جادوں کو لہو، قافلہ سالار گیا!
ہائے، کتنا زندگی و امن کا سودا بھی عجیب
ایک شے جیت لی اور دوسری شے ہار گیا!
ایک شب کی بھی تو پروانے کو مہلت نہ ملی
کہ ذرا شمع سے تشریحِ وفا کر لیتا
کم سے کم اتنی ہی مل جاتی اسے فرصتِ مرگ
سینہ چپا کا ان حوادث کی دوا کر لیتا
عبرت انگیز ہیں انساں پہ نگاہیں — دیکھو!
زیست پر غور کرو، زیست حباب آسا ہے
چند سانسیں جو ملی ہیں، وہ سکوں سے کٹ جائیں
امن کی قدر کرو، جنگ میں رکھا کیا ہے!

(نوٹ: نظم کا پہلا حصہ میں نے ۱۰ جنوری کی شب ہی میں مکمل کر لیا تھا۔ ۱۱ جنوری کی صبح وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری کی مرگِ ناگہاں کی اطلاع ملی اور ایک مکمل طربیہ نظم کو المیہ موڑ دینا پڑا)
اعجاز صدیقی

سلام مچھلی شہری

شہیدِ امن

صبح ہی رہی تھی بزم کہ سنسان ہو گئی
اک شمع راہِ امن میں قربان ہو گئی
یہ شمع نورِ ہند کی زرّیں مثال تھی
یہ شمع اک نشانِ جلال و جمال تھی
رہتی تھی فکر اس کو قریب اور دور کی
خود نور تھی مگر متلاشی تھی نور کی
کیسے کہوں، سفر ہی میں روپوش ہو گئی
دے کر پیامِ صبح یہ خاموش ہو گئی

بن کر یہ پھر تو دلِ جمہور زندہ ہے
گل ہو گئی ہے شمع مگر نور زندہ ہے
اس نور کا رہے گا ہمیشہ ہی احترام
دے گی ہر ایک شمعِ وطن امن کا پیام
اس نور میں ہے سو گیا تاشقند بھی
جس کی چمک عزیز ہے ہم کو پسند بھی
خالی نہ ہوگی نور سے اس گلستاں کی گود
سونی نہ ہوگی مادرِ ہندوستاں کی گود

محمد عمر خاں ثمر جبّاروی

قطعاتِ تاریخ

ہائے دلا! اے جہاں لال بہادر شاستری
۱۳۸۵ھ
معزز وزیرِ اعظم بھارت
۱۹۶۶ء

نہ اب صدرِ مجلس نہ وہ انجمن
جدھر دیکھئے مرد و زن نوحہ زن
ہے ارضِ وطن آج تاریک تر
جو گل ہو گیا ہے چراغِ وطن
۱۳۸۵ھ

آہ اچانک گر پڑا کوہِ گراں
مبتلائے غم ہوا سارا جہاں
شاستری جی آپ کے جانے کے بعد
ہے دیا مرجھا چمن پر آئی خزاں
۱۹۶۶ء

صفحہ ۴ سے آگے

کا واقعہ اس میں بھی درج ہے:۔

باقی جو رہا کئی گھڑی روز — پیدا ہوئی شکل بخت فیروز
سرکار سے چوبدار آیا — ایک جزو دگر بھی اپنے ساتھ لایا
تھی نثر کہ جس پہ یہ فرمان — ہو نظم بہت فصیح و رخشاں
آگے جو خوشی تھی اب بھی ہوگی — گھبرا نہ تری طلب بھی ہوگی
کرے اسے جلد جلد موزوں — بیتاب نہ ہو کہے گا مضموں
اس جزو کو میں نے سر پہ رکھا — آنکھوں پہ کبھی جگر پہ رکھا
امید ہوئی جو چہرہ آرا — صبح شب کلفت آشکارا
تسکین سی میرے دل نے پائی — کرنے لگا میں سخن سرائی
اس جزو کو نظم کر کے رکھا — پیمانۂ شوق بھر کے رکھا[1]

نثر اور نظم کے بیان میں جو فرق ہے وہ یہ کہ اول الذکر میں خود بادشاہ نے دیوانِ خاص میں وہ نثر کی کتاب دی اور آخر الذکر میں چوبدار گھر پر دے گیا۔ اگر یہ عشق نامہ فارسی کا منظوم ترجمہ تھا جسے بادشاہ اپنے نام سے منسوب کرنا چاہتے تھے تو پھر اسیر کو اتنی بھی جرأت یا اجازت کیسے ہوئی کہ وہ اشارۃً اس کا ذکر کریں اور اس لین دین کے رازدار چند لوگ ہوں۔ اسیر نے نام بتا دیا ہوتا تو اچھا تھا لیکن جب نہیں بتایا تو محض ایک دور از کار قیاس پر ٹھوس شہادتوں، منطقی دلائل اور مصدقہ روایتوں کو نظر انداز کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ کیوں نہ دوسری مثنویوں کو بھی اس شبہ میں شامل کر لیا جائے۔ بلکہ جب اسیر کے بیان میں اختلاف ہے اور ہمارے نزدیک ہر بیان برحق ہے تو ہر بیان کے لیے ایک مثنوی واجد علی شاہ کے ذخیرہ سے نکال لیجئے۔ واجد علی شاہ کی کئی مثنویاں نثر سے نظم میں منتقل ہوئی ہیں۔ جستجو کو صرف ایک ہی مثنوی تک کیوں محدود رکھیے؟ واجد علی شاہ کی مثنوی اسیر سے اس لیے منسوب کی جا رہی ہے کہ اچھی ہے اور واجد علی شاہ کو خدا نے اتنی توفیق ہی کب دی تھی کہ وہ کچھ اچھا کہہ سکیں یا کر سکیں۔ اسیر مسلم الثبوت استاد، واجد علی شاہ کو لائق شاگرد میں بھی شمار کرنے میں تکلف۔ اسیر ساری عمر شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے، واجد علی شاہ کو تمام عمر عیاشیوں سے فرصت ہی کب تھی۔ اسیر کی ہمنوائی میں سیکڑوں اسیر، اختر کی بداختری کا کوئی شریک نہیں لیکن ان تمام خارجی اور غیر ضروری مصلحتوں سے خالی الذہن ہو کر میزان سخن میں صرف دونوں کی مثنویوں کو رکھیے جب معلوم ہوگا کہ مثنوی گوئی میں کس کا پلہ بھاری ہے۔ چند شعر سامنے رکھ کر اگر آپ فیصلہ کریں گے تو یہاں بھی وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو چند مسدس سامنے رکھکر انیس اور دبیر کے معاملے میں ہوا ہے۔[2] کلام کا اگر صرف بلند اور روشن حصہ ہی سامنے رکھا گیا تو زیادہ بلندی اور روشنی بھی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ اور سخن سنج حسب ضرورت اور حسب طبیعت اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ شیخ صاحب[3] کے نزدیک ۱۹۵۹ء میں عشق نامہ کو واجد علی شاہ کی طرز سخنوری سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا حالانکہ وہ اسی عشق نامہ کے اشعار پندرہ بیس برس ان الفاظ کے ساتھ پیش کرتے رہے ہیں:۔

"سلطان عالم خود بھی لکھتے ہیں ص ۱۰۳ ...... چنانچہ خود وہ لکھتے ہیں ص ۲۱۰ ..... موصوف نے اس طرح نظم کا جامہ پہنایا ہے ص ۲۱۳ ..... پری خانہ میں خود بھی لکھتے ہیں ص ۲۳۶ ...... جانِ عالم خود لکھتے ہیں ص ۲۳۹ ...... اس واقعہ کو جانِ عالم پری خانہ منظوم میں بھی اس طرح نظم کا جامہ پہناتے ہیں ص ۲۴۳ ...... وغیرہ[4]"

اس طویل مدت کے بعد لازم تھا کہ اگر رائے تبدیل کی تھی تو تبدیلی کا سبب مفصل لکھا جاتا نہ کہ حاشیہ پر بغیر کسی سند یا دلیل کے۔ شیخ صاحب کے علاوہ مولوی نجم الغنی بھی سخن فہم ہیں اور اسی عشق نامہ سے نہایت فراخدلی کے ساتھ اشعار کا نقل کرنا ثبوت ہے اس امر کا کہ خواہ مولوی صاحب نے اور کوئی مثنوی نہ پڑھی ہو یہ مثنوی ضرور پڑھی ہے۔ اس کے باوجود ان کا فیصلہ ہے کہ:۔

"کہ آرام طلبی کی حالت میں یعنی جلسۂ عیش و عشرت میں بیٹھے بیٹھے عشق بازی کی معمولی باتیں ڈھیلی ڈھیلی بندشوں میں باندھ کر جیسی تیسی برابر کہے جاتے تھے"[5]

کہاں شیخ صاحب کے بقول "اسیر کا رنگ" اور کہاں مولوی صاحب کے الفاظ میں معمولی باتیں ڈھیلی ڈھیلی بندشیں ببیں تفاوت رہ از کجا تا بکجا۔ دبستان لکھنؤ کے تمام اکابر شعرا کے کلام کا بغائر مطالعہ کرنے والے کے بیان سے ہم خواہ اتفاق نہ کریں جب بھی فریقین کے "بعد المشرقین و المغربین" کے اظہار کے بعد واجد علی شاہ اور اسیر کی مساوی حیثیت کا اس سے بہتر اور کون سا پیرایہ ہو سکتا ہے کہ جدید تحقیق و تنقید کے ایک ممتاز فرد کی نظر میں:۔

---

[1] دورۃ التاج مطبوعہ مطبع سلطانی لکھنؤ ۱۲۷۰ھ ص ۲۲۶-۲۹

[2] انیس اور دبیر کے معاملے میں ایک دلچسپ مواد "ہماری زبان" کی کسی آئندہ اشاعت میں انشاءاللہ پیش کیا جائے گا۔

[3] بیگمات اودھ۔ یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں میں شایع ہوتے رہے اور ۱۹۵۹ء میں کتابی صورت میں شایع ہوئے۔

[4] تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۱۱۱۔

"جب ہم اس کلام کا (واجد علی شاہ کے کلام کا) مقابلہ اسیرؔ، برقؔ، امانتؔ، قلقؔ، بحرؔ، سحرؔ وغیرہ کے کلام سے کرتے ہیں جو ان کے درباری شاعر تھے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کا کلام کسی طرح ان میں سے کسی سے کم نہیں بلکہ امانتؔ وغیرہ کے مقابلہ میں ان کی برتری اور فوقیت مسلم ہے۔"[1]

واجد علی شاہ کے انداز کلام کے بارے میں خود اسیرؔ کا بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اور ایک صرف اسیرؔ کے بیان پر کیا موقوف، متضاد اور متفرق بیانات کی کمی نہیں، بقول شیفتہ "جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر سخن فہم کوئی رائے رکھتا ہے" اور ایک رائے کو دوسری پر ترجیح دینا بھی سخن فہمی کا کام ہے۔ محمد قلی قطب شاہ والیِ گولکنڈہ (۱۰۲۰-۹۹۸ھ) سے واجد علی شاہ کی مثنوی ثبات القلوب (۱۳۰۲ھ) تک تقریباً تین سو برس اردو شاعری میں اسلوب اور زبان کی تبدیلی اور ترقی کے ملتے ہیں اور اگر آپ اسی مثنوی عشق نامہ کا بغور مطالعہ اور موازنہ کریں تو متعدد اشعار ملیں گے جن میں الفاظ کی خفیف تبدیلی کے ساتھ کوئی شعر محمد قلی قطب شاہ کے کسی شعر کا مماثل نظر آئے گا۔ کوئی اسیرؔ کے کسی شعر کا عکس ہوگا اور کوئی خود واجد علی شاہ کے طبعزاد شعر کا نقش اول ہیں۔ اس مقابلہ اور موازنہ سے بحث کو طول دینا مقصود نہیں۔ صرف اس کی نشان دہی منظور ہے کہ سخن فہمی کی کسوٹی کچھ زیادہ قابل اطمینان نہیں ؎

ہم اپنی کہیں گے تم اپنی کہو گے
نہ جھگڑا چکے گا ہمارا تمہارا

بحث طول کھینچی جائے گی اور بات بجائے سلجھنے کے اور الجھ جائے گی۔ مسکت جواب وہ ہے کہ جامع اور مانع ہو اور فرار کے لیے باسانی راستہ نہ ملے، اور ایسا جواب واجد علی شاہ کی شخصیت اور کلام کا بخوبی مطالعہ کرنے کے بعد ہی ہاتھ آسکتا ہے۔ یہ شعر ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

کہا گیا تھا کسی اور سلسلے میں لیکن اس کی صداقت کا پرتو جتنا واجد علی شاہ کے کلام میں ملتا ہے بہت کم کسی اور کے کلام میں نظر آئے گا۔ معترضین میں سے کسی نے بھی خصوصیات کلام واجد علی شاہ کی بحث اٹھائی ہوتی تو ہم پر بھی اس کا جواب فرض ہی ہوتا اور ہم بھی دیکھتے کہ وہ خصوصیتیں کس حد تک اسیرؔ کے کلام میں ہیں اور کس حد تک واجد علی شاہ کے کلام میں لیکن چونکہ ایسا نہیں کیا گیا بلکہ واجد علی شاہ کا کلام تو درکنار خود ان بیانات کو بغور نہیں دیکھا جن سے استفادے کا دعویٰ ہے تو فی الحال ہم بھی اپنی پرچھائیں سے خود گفتگو کرنے کے مشتاق نہیں۔ اسی لین ڈوری کے سہارے پھر آگے بڑھتے ہیں جو پہلے سے نشان دہی کے لیے موجود ہے۔

واجد علی شاہ کے کلام کے مقابلہ میں شیخ صاحب نے جس پلڑے میں محض اپنی سخن فہمی کو رکھنا کافی سمجھا اس میں اگر تمام مروجہ شہادتیں اور بھی رکھ دی جائیں جب بھی وہ پلڑا سبک ہی رہے گا۔ مثال کے طور پر اسی رسالہ "زمانہ" میں کہ جس میں وہ عرصہ تک مضمون لکھتے رہے ہیں۔ ایک بیان ملتا ہے۔ آفتاب الدولہ قلقؔ کا، جو شنیدہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کیونکہ راوی اگرچہ قلقؔ ہیں لیکن روایت قلقؔ کے قلم سے نہیں، فاضل لکھنوی کے قلم سے ہے، "قلقؔ کے انتقال کے بعد"[2] اس بیان کے معنی اور مطالب کو کون سمجھائے جبکہ خود فاضل مقالہ نگار اس کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ جس شمارے میں صفحہ ۳ پر قلقؔ کے حوالے سے یہ روایت نقل کی گئی، اسی شمارے میں چند صفحات کے بعد صفحہ ۱۶ پر بطور خود لکھتے ہیں۔

"اصل یہ ہے کہ واجد علی شاہ کے عادات کو حق ہی بارہ برس کی عمر میں محلات کی وضعدار خادمہ عورات نے بگاڑ دیا تھا۔ اور اس کا اقرار خود شاہ مغفور نے اپنی ایک منظوم سوانح عمری میں کیا ہے۔"

اس خود نوشت منظوم سوانح عمری کا نام درج نہیں لیکن اگر یہ عشق نامہ منظوم نہیں تو اور کون سی سوانح عمری ہے اور اگر یہی عشق نامہ منظوم وہ سوانح عمری ہے تو اسیرؔ نے کون سا عشق نامہ کہا؟ بیان کا تضاد خود گواہی دے رہا ہے کہ مقالہ نگار نے عشق نامہ نامی کتاب دیکھی ہی نہیں۔ دونوں باتیں سنی سنائی لکھ گئے ہیں۔ اور اس بے سمجھے بوجھے رائے زنی کرنے میں اگر انھوں نے سبقت کی تو موجودہ نسل میں "زمانہ" کے اسی شمارے کو سند میں پیش کرنے پر سید سلیمان حسین صاحب[1] نے بھی کچھ کم جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ انھوں نے کچھ پڑھا اور کچھ نہ پڑھا۔ یا کچھ سمجھے اور کچھ نہ سمجھے۔ یا کچھ حوالے کے قابل نظر آیا اور کچھ نظر انداز کر گئے؟

(باقی آئندہ)

---

[1] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص۔

[1] سید سلیمان حسین انھیں صفحات میں یہ بیان نقل فرما چکے ہیں۔ دیکھیے ہماری زبان ۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء

[2] زمانہ جولائی ۱۹۱۰ء، جلد ۱۵ نمبر ۱، صفحہ ۳ اور ۱۶۔

مراسلات :

کچھ فضلی کی کربل کتھا کے بارے میں

"فضلی کی کربل کتھا کے بارے میں" ہماری زبان کی مختلف اشاعتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ اردو میں اس کا صرف ایک نسخہ ڈاکٹر اشپرنگر کے کتب خانہ میں تھا جس کا عکس ڈاکٹر مختار الدین احمد نے حاصل کیا اور اب اسے علمی دنیا کے سامنے مطبوعہ صورت میں پیش کیا ہے۔[1]

"ڈاکٹر مختار الدین احمد کو بجا طور پر اردو کے محسنوں میں شمار کیا جائے گا جنھوں نے اپنے قیام یورپ کے دوران ۱۹۵۶ء میں "کربل کتھا" کا مخطوطہ ٹوبن گن یونیورسٹی (جرمنی) کے کتب خانے سے پہلی بار دریافت کیا۔"[2]

"گذشتہ اکتوبر میں دیر آید درست آید کا مصداق بن کر "کربل کتھا" شائع ہو گئی۔ ملک کے دو ممتاز محققین جناب مالک رام اور (میرے کرم فرما) ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اس کی ترتیب و تحشیہ میں جو خون جگر صرف کیا ہے، اس پر انھیں جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔"[3]

لیکن ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۵۸ء میں یورپ کے کتب خانہ سے فضلی کی کربل کتھا کا عکس وہ بھی اپنے ساتھ لائے تھے اور اس کی اشاعت غالباً ۱۹۶۰ء میں آفسٹ یا ٹائپ میں ہو چکی تھی۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب کی تحریر ملاحظہ فرمائیے۔

"میں ۱۹۵۸ء میں ہندوستان واپس آگیا۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ میں نے یورپ کے کتب خانوں سے کچھ نایاب مخطوطات کے عکس بھی حاصل کیے جو دراصل اردو کی ادبی تاریخ کے گمشدہ اوراق ہیں۔ ادب کے حیات افروز عناصر و اقعیت بہم پہنچانے اور اپنی کھوئی ہوئی دولت کو پھر پانے کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ یونیورسٹی دہلی کا شعبہ اردو ان مخطوطات کو حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع کرے تاکہ ان مآخذ سے تاریخ اور تہذیب کے سمجھنے میں مدد مل سکے۔ اسی لیے شاید ایک مستشرق نے نصیحت کی تھی (KNOW THY TEXIS) اس سلسلے کی پہلی دو کتابیں (فضلی کی کربل کتھا اور نو آئین ہندی۔ اعظم الدولہ سرور کا عمدۂ منتخبہ) پنڈت جی (جواہر لال نہرو) کے نام معنون کی گئیں۔۔۔۔۔۔ پنڈت جی ازراہ علم پروری اور دلنوازی نہ صرف اس انتساب کو شرف قبول بخشا بلکہ ان دو کتابوں کو لینے کے لیے بنفس نفیس دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بھی تشریف لائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہماری یہ کتابیں آفسٹ اور ٹائپ میں چھپی تھیں۔"[4]

تعجب ہے کہ خواجہ صاحب کی مرتب کردہ اور دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے شائع شدہ کتاب مالک رام، مختار الدین احمد، خلیل الرحمن اعظمی، محمود الہی یا پھر دوسرے صاحب قلم و صاحب مطالعہ حضرات کی نظر سے کیوں نہیں گزری؟

(مناظر عاشق ہرگانوی)

جواب استفسار

ہماری زبان ۸ رجنوری ۱۹۶۶ء کے ایک استفسار کا جواب درج ذیل ہے۔

چار سو پھیلنے کی جا جو نہیں پاتی ہیں
بیلیں گھبرا کے درختوں پہ چڑھی جاتی ہیں

مطلع: رات، غربت کی حقیقت میں غضب ہوتی ہے
مصنف: پیارے صاحب رشید
مطبوعہ جلد مراثی۔ تحفۂ خلد ۱۳۰۳ھ

آپ کی جگہ نہ خلل اعتقاد میں
پیچھے رہے نماز میں آگے جہاد میں

مطلع: جام جہاں نما سخن آبدار ہے
مصنف: میر وحید
مطبوعہ جلد مراثی، ریحان غم ج ۱ ص ۱۵۵

(جعفر رضا شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی)

کتاب الہدیٰ کی ضرورت ہے

سیٹھ یعقوب حسین صاحب مدراسی مرحوم کی شائع کردہ کتاب الہدیٰ ایک نہایت مبسوط و مقبول عام تالیف ہے۔ جس کی کئی جلدیں ہیں۔ اس کا مقدمہ ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا، اور پہلی جلد آخر ۱۹۲۳ء یا شروع ۱۹۲۴ء میں منظر عام پر آئی تھی باقی جلدیں بھی ممکن ہے شائع ہوئی ہوں مجھے اس کتاب کی ایک تالیف کے سلسلہ میں ضرورت ہے۔ اگر کوئی صاحب ازراہ کرم قیمتاً یا عاریۃً عنایت فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔

---

[1] "ہماری زبان" ۸ رنومبر ۱۹۶۵ء ص ۲
[2] "ہماری زبان" ۱۵ رنومبر ۱۹۶۵ء ص ۱۲
[3] "ہماری زبان" ۱۵ ردسمبر ۱۹۶۵ء ص ۳
[4] ماہنامہ "جہاں نما" دہلی، دسمبر ۱۹۶۵ء، ص ۶

خواہ "ہماری زبان" کے ذریعے سے مطلع فرمائیں یا بالا بالا میرے نام عنایت نامہ روانہ فرمائیں اپنا پتہ ذیل میں درج کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں اگر کوئی صاحب ایسی اطلاع بھی دیں گے کہ جس سے کتاب کی دستیابی میں مدد ملے تو ان کا بھی شکر گذار ہوں گا۔

(احترام الدین احمد شاغل)

پتہ:-

مولوی احترام الدین احمد شاغل جنرل سکریٹری
انجمن ترقی اردو راجستھان
تعلیم منزل جے پور
(راجستھان)

لغات فیضی

ایک مخطوطہ "لغات فیضی" کے نام سے دستیاب ہوا ہے اور اب اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دہلی کی ملکیت ہے یہ مخطوطہ ۱۲۱۱ھ کا قلمی ہے اس کا اول و آخر ناقص ہے شروع میں سرواڈک طاس کی ایک مہر ہے چند اور مہریں بھی ہیں۔ جو ٹھیک پڑھی نہیں جاتیں پہلے صفحہ پر مولانا عبدالرزاق کانپوری مصنف البرامکہ وغیرہ کا ایک نوٹ ہے جس میں کتاب کی "تاریخی عظمت" کا اظہار کیا گیا ہے اسی قسم کی ایک تحریر صدر العلماء، علامہ ذوالفقار احمد صاحب کی ہے۔ اگر لغات فیضی کا کوئی مطبوعہ نسخہ یا مخطوطہ کسی صاحب کے پاس ہو تو براہ کرم مطلع فرمائیں تاکہ مقابلہ کیا جا سکے تاریخ سے ثابت ہے کہ لغات فیضی کے نام سے ایک لغت علامہ فیضی نے "بلوغ" کی تھی پیش نظر مخطوطہ میں سند کے طور پر فیضی نے اپنے اشعار بھی درج کیے ہیں۔

کوثر چاند پوری
(ریسرچ ٹیکنیک ایڈائزر بورڈ، آیوروید، یونانی، دہلی)

ایک اعلان

بزم ادب، شاخ انجمن ترقی اردو سمری بختیار پور (ضلع سہرسہ بہار) کی ایک منظور شدہ تجویز کے مطابق جناب مجاہد حسین ہاشمی، جنرل سکریٹری، بزم ادب سمری بختیار پور (سہرسہ بہار) نے اردو سے متعلق اکثریت کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی کدورت دور کرنے اور سلجھے ہوئے ذہن و فکر کی ایک نئی نسل تیار کرنے کے لیے غیر مسلم سیاست داں، لیڈر، مبلغ، مورخ، مفکر، ادیب و شاعروں کے اردو کے متعلق گراں قدر خیالات و ارشادات نیز غیر اردو زبانوں کے اخبارات کے اس سے متعلق اداریوں کو یکجا کرکے دیوناگری رسم الخط میں شائع کرنے کا پروگرام طے کیا ہے۔

اردو انجمنوں اور اردو دوستوں سے مندرجہ مواد کی فراہمی کی گئی ہے۔ (نامہ نگار)

دفتر بزم ادب
شاخ ریاستی انجمن ترقی اردو
سمری بختیار پور (سہرسہ، بہار)

تلوک چند محروم کے انتقال پر تعزیتی جلسے

انجمن ترقی اردو امرتسر

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ امرتسر کی ایک ماتمی میٹنگ زیر صدارت رائے بہادر شاستری پرکاش چند مہرہ منعقد ہوئی جس میں ملک کے نامور مشاہیر اور اہل قلم نے شرکت کی۔

جناب تلوک چند محروم کی ادبی خدمات کی سراہنا کی گئی اور ان کی زندگی پر کماحقہ، روشنی ڈالی گئی اور تعزیتی تجویز پاس ہوئی

(پورن سنگھ ہنر سکریٹری)

انجمن تعمیر اردو

دلّی ۱۰ر جنوری۔ پنجاب کے شاعرِ اعظم اور اردو کے معلم استاد شاعر حضرت تلوک چند محروم کی وفات پر انجمن تعمیر اردو کے زیر اہتمام دلی کے نمائندہ اردو ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا ایک جامع اجتماع، اردو ہال اردو بازار دلی میں منعقد ہوا۔ محترمہ بیگم حیات اللہ انصاری نے صدارت فرمائی۔ جناب گوپی ناتھ امن، جناب گلزار دہلوی، پنڈت بالمکند عرش ملسیانی، جگناداس اختر، مولانا انور صابری، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے تقاریر کیں۔

زبیش کمار شاد نے ایک مضمون پڑھا۔ اور امن صاحب، انور صابری، گلزار دہلوی، ضیا فتح آبادی، بہار برنی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

اختتام پر صدر جلسہ بیگم حیات اللہ انصاری صاحبہ نے خراج عقیدت پیش کیا۔

(گلزار دہلوی)

بزم ادب کروڑی مل کالج دلّی

بزم ادب، کروڑی مل کالج دلّی یونیورسٹی کا ایک تعزیتی جلسہ پروفیسر تلوک چند محروم کے انتقال پر ملال پہ اظہار رنج وغم کے لیے زیر صدارت ڈاکٹر خلیق انجم صدر شعبہ اردو منعقد ہوا جس میں صدر موصوف نے آنجہانی محروم صاحب کی ادبی، علمی اور شعری خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی موت کو دنیائے اردو کے لیے ایک عظیم سانحہ قرار دیا اور اس کے بعد ایوان نے اظہار عقیدت کے لیے دو منٹ کی خاموشی اختیار کرتے ہوئے تعزیتی قرارداد منظور کی۔

(سکریٹری)

بزم ادب چنڈی گڑھ

بزم ادب چنڈی گڑھ کے ایک جلسے میں ہندوستان کے مشہور و معروف اردو شاعر جناب تلوک چند محروم کی وفات حسرت آیات پر دلی غم و رنج کا اظہار کیا گیا اور ایک تعزیتی تجویز پاس کی گئی۔

(درشی پٹیالوی جنرل سکریٹری)

ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد

حیدر آباد، ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے ۹ر جنوری کی صبح ۱۰ بجے "ایوانِ اردو" میں اردو کے ممتاز قومی شاعر پروفیسر تلوک چند محروم کے سانحۂ ارتحال پر جلسۂ تعزیت پروفیسر سید محمد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب ضیاء الدین احمد شکیب اور ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ نے محروم کی شاعری اور شخصیت پر تقاریر کیں۔

پروفیسر سید محمد صاحب نے صدارتی تقریر میں محروم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ وقار خلیل نے ایک نظم پڑھی۔ آخر میں تعزیتی قرارداد پاس کی گئی۔

(وقار خلیل)

اسلامیہ کریمیہ ڈگری کالج اندور

۹ر جنوری ۱۹۶۶ء کی شام کو اردو کے مشہور شاعر تلوک چند محروم کی وفات پر بزم ادب کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا جس کی صدارت بزم کے سرپرست اور کالج کے پرنسپل جناب ڈاکٹر انور علی صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی نے فرمائی۔ بزم کے نگراں اور شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے محروم کی زندگی اور شاعری کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

اس کے بعد ڈاکٹر انور علی صاحب نے تعزیتی قرارداد پیش کی جسے متفقہ طور پر پاس کیا گیا۔

(حاتم علی رزمی مہدی)

لال بہادر شاستری کے انتقال پر تعزیتی جلسے

انجمن ترقی اردو دلی

نئی دلی ۱۰ر جنوری۔ گزشتہ روز یہاں پر انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ کی مجلس عاملہ کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں مسٹر لال بہادر شاستری کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت جناب پنڈت سندر لال صاحب صدر انجمن نے کی۔ دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر تعزیتی ریزولیوشن منظور کیا گیا جس میں مسٹر لال بہادر شاستری کی امن کے لیے کوششوں کو بہترین الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اور تاشقند سمجھوتہ کا خیر مقدم کیا گیا۔

(الجمعیۃ)

انجمن ترقی اردو لکھنؤ

انجمن ترقی اردو کا ایک جلسہ زیر صدارت جناب ڈاکٹر عبدالعلا خاں خلیل ریاستی انجمن ترقی اردو کے دفتر میں ۱۶ر جنوری کو ہوا۔

انجمن کے اس جلسہ میں آنجہانی شری لال بہادر شاستری وزیر اعظم ہند کے انتقال پر اظہار غم کیا گیا۔ اور نسیم کنہاچی، ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، مولانا ہاشم میاں، سید فدا حسین، اور ساحر لکھنوی وغیرہ نے اپنے اپنے تاثرات غم کا اظہار کیا اور حسب ذیل تعزیتی تجویز پاس کی گئی۔

"انجمن ترقی اردو لکھنؤ کا یہ ہنگامی جلسہ اپنے محبوب وزیر اعظم جناب لال بہادر شاستری کی ناگہانی موت پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور نہ صرف اپنے ملک و قوم کے لیے بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک سانحہ عظیم متصور کرتا ہے۔

آنجہانی وزیر اعظم جناب لال بہادر شاستری صرف ایک تجربہ کار سیاستداں، عظیم المرتبت اور مستقل مزاج انسان ہی نہیں تھے بلکہ وہ اردو اور فارسی کے بھی ماہر تھے۔ شاستری جی نے اہم اور پیچیدہ مسائل کو اپنے دور وزارت میں جس خوبی اور ہمت کے ساتھ حل کیا اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ پنڈت نہرو کے انتقال کے بعد ملک میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کو انھوں نے اپنی وزارت عظمیٰ کے مختصر سے عرصہ میں بڑی حد تک پر کر دیا وہ ملک میں جمہوریت کی سب سے بڑی مثال تھے ان کی امن پسندی اور بلند مقاصد کے حصول کی یادگار ہندوستان پاکستان کی دوستی کا بے مثال تحفہ ہے۔ شاستری جی نے جس ہمت مردانہ کے ساتھ جنگ میں ہندوستان کے وقار کو بلند رکھا اسی عزم و حوصلہ کے ساتھ وہ امن کے مجاہد ثابت ہوئے ان کے انتقال سے ملک ایک عظیم مدبر دیانتدار مستقل مزاج فرض شناس اور بہترین انسان سے محروم ہو گیا۔"

یہ جلسہ ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کرتا ہے اور ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

(جنرل سکریٹری)

انجمن ترقی اردو بنارس

انجمن ترقی اردو بنارس کے زیر اہتمام مورخہ ۱۲ر جنوری ۱۹۶۶ء کو لال بہادر شاستری وزیر اعظم ہند کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں مندرجہ ذیل تعزیتی قرارداد پاس کی گئی۔

انجمن ترقی اردو بنارس کا یہ ہنگامی اجلاس اپنے پیارے وزیر اعظم آنجہانی لال بہادر شاستری کی اچانک وفات حسرت آیات پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کے پسماندگان کے غم میں اپنے کو برابر کا شریک سمجھتا ہے اور دست بدعا ہے کہ ان کی روح کو ابدی سکون و آرام حاصل ہو و نیز وابستگان کو صبر جمیل عطا ہو۔

یہ وہ وزیر اعظم ہیں جنھوں نے تاریخی مقام تاشقند (روس) میں ہند و پاک دوستی و قیام امن کے لیے جس خلوص کے ساتھ کام انجام دیا ہے اور اپنی جان عزیز تک قربان کیا ہے سارا ملک اس کی قدر کرتا ہے خدا ان کے اس شاندار کارنامے کو باقی رکھے۔

انجمن ترقی اردو بنارس کا یہ اجلاس آنجہانی وزیر اعظم کی اچانک موت سے تمام باشندگان ملک کو خصوصاً اہالیان ضلع بنارس کو جو نقصان عظیم پہنچا ہے اس کو قطعی ناقابل تلافی تصور کرتا ہے۔

(دتا رسول سکریٹری انجمن ترقی اردو بنارس)

انجمن اردوئے معلیٰ کے زیر اہتمام یوم جمہوریہ کے موقع پر بزم سخن

۲۸ر جنوری۔ انجمن اردوئے معلیٰ (شعبۂ اردو) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام گزشتہ سالوں کی طرح امسال بھی یوم جمہوریہ کے موقع پر ایک محفل شعر و سخن ہوئی جس کی صدارت پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے کی۔ جن شعراء نے اپنا کلام سنایا ان کے نام درج ذیل ہیں:

پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر منیب الرحمٰن، خواجہ مسعود علی ذوقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، وارث کرمانی، شہریار، ڈاکٹر رشید بدر، شوریدہ کاشمیری، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، صبا جائسوی۔

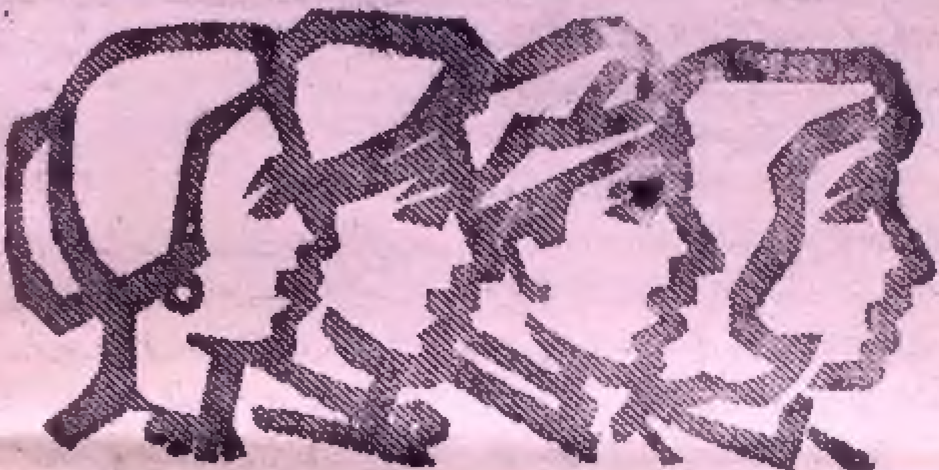
(نامہ نگار)

ادارۂ جدید مدراس کی ایک نشست

۹ر جنوری اتوار کی شام ، بجے سالِ نو کی ایک استقبالیہ تقریب کی نشست دانش فرازی صاحب کے یہاں ترتیب دی گئی۔ حضرت ریاض تیلوری نے صدارت کی۔

ناول "بیبرد" کے مشہور مصنف رشید مدراسی کی ایک انشائیہ "سالِ نو کی آمد پر" آذر بیابانی نے پڑھی چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر رشید مدراسی شریک نہ ہو سکے۔ تامل ناڈو کے نامور افسانہ نگار علی اکبر آمبوری نے ایک خاص تاثر کو اپنے مختصر افسانے میں پیش کیا۔ آپ کا افسانہ مجموعی طور پر بہت پسند کیا گیا۔ صدر محترم ریاض تیلوری کی ایک دلچسپ چیز جو خاص مذکورہ نشست کے لیے لکھی گئی تھی، زبان اسلوب اور انشائے لطیف کی لطافتوں سے مملو تھی۔ بڑی دلچسپ ثابت ہوئی۔ کاوش بدری کی رباعیات اور ایک طویل قصیدے کا آہنگ محسن کاکوروی اور مرزا سودا کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات کا غماز تھا۔ آذر بیابانی نے سالِ نو کی آمد پر مبنی تازہ نظم سے محظوظ کیا۔ آخر میں دانش فرازی صاحب نے غزل کے اشعار پیش کیے۔

(معتمد ادارۂ جدید مدراس)



باڈک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر شمیم الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا، اور نذیر حسن پبلشر نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ سے شائع کیا